بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

مرض خواہ جسمانی ہو یا روحانی یا اخلاقی، اپنے اندر مضرت کے متعدد پہلو رکھتا ہے۔ مگر یہ اُس حالت میں خاص طور پر تشویشناک ہوتا ہے جب اس کی نوعیت کا صحیح طور پر اندازہ کر کے اس کے تدارک کی فکر نہ کی جائے۔ پاکستان شروع ہی سے غیر مسلم طاقتوں کی آنکھوں میں خار بن کر کھٹک رہا ہے اور اس وجہ سے اسے مختلف روگ لگانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ اسے اہلِ پاکستان کی بدبختی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس روگ کی حقیقی نوعیت کو سمجھ کر اسے دُور کرنے کی طرف آج تک بہت کم توجہ دی گئی ہے۔

مغربی طاقتوں کی پاکستان سے پرخاش کی اصل وجہ صرف ایک ہی ہے کہ یہ ملک احیائے اسلام کے جذبے کے تحت معرضِ وجود میں آیا اور اس نے قومیت کے لیے ایک ایسی اساس فراہم کی جس سے اہلِ مغرب کو شدید نفرت ہے۔ رنگ، نسل، زبان، جغرافیائی حدبندی، یعنی قومیت کے وہ عناصر ترکیبی جن سے اہلِ مغرب آشنا ہیں، ان میں سے کوئی عنصر بھی خطۂ پاک کی تشکیل و تاسیس میں کارفرما نہیں رہا ہے، بلکہ صحیح بات تو یہ ہے کہ ان میں سے کسی ایک کا وجود ہی سرے سے یہاں نہ تھا کہ وہ اس نئی قومیت کی اساس بنتا۔ اسلام ہی پاکستانی قومیت کی اساس ہے۔ اب اگر یہ ملک اپنے مزاج کے مطابق فطری طور پر ترقی کرتا ہے تو یہ اہلِ مغرب کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ مغربی تہذیب کے علمبردار قومیت کے بارے میں دوسرے مسلم ممالک کے فکر و نظر کے زاویے تو کافی حد تک تبدیل کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ انہوں نے زبردست پروپیگنڈے کے زور سے ان کے اندر قومیت کے غیر اسلامی عنصر کو اُبھارا ہے اور انہیں کسی نہ کسی طرح یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ ان کی قومیت کی اساس ایک کلمہ کا

اشتراک نہیں بلکہ زبان یا وطن یا نسل کا اشتراک ہے۔ آج ہم یہ ان لوگوں کے پراپگنڈے ہی کا اثر دیکھ رہے ہیں کہ پوری عرب دنیا کا شیرازہ منتشر ہو چکا ہے۔ پہلے لسانی امتیاز کو بنیاد بنا کر عرب ممالک کو باقی دنیائے اسلام سے منقطع کیا گیا۔ پھر خود ان ممالک کے اندر جغرافیائی حد بندیوں کا شعور پیدا کر کے اور نظریاتی کشمکش برپا کر کے مزید انتشار پیدا کر دیا گیا۔

پاکستان میں چونکہ اسلام کے سوا قومیت کی کوئی دوسری بنیاد فراہم نہیں ہو رہی ہے اس لیے یہاں صوبائی تعصبات، زبان کے تعصبات اور طبقاتی منافرت پھیلا کر اسلام کو کمزور کرنے کی مذموم کوششیں کی جا رہی ہیں جن کے نتائج اب کھل کر ہمارے سامنے آ رہے ہیں۔ اسلام سے ہٹ کر جو طبقے یہاں سرگرم عمل ہیں ان کا تعلق خواہ کسی بازو سے ہو، مگر وہ سب اپنی قوتوں کو مجتمع کر کے اسلام کو شکست دینے کے لیے پوری طرح ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ انگریز چونکہ اول روز ہی سے اس بات کا آرزومند تھا کہ دنیا کے کسی خطے میں اسلام ایک انقلاب انگیز قوت بن کر اُبھرنے نہ پائے اس لیے اس نے جانے سے پہلے اس بات کا پورا پورا التزام کیا کہ یہاں ایک ایسا طبقہ پیدا کر دے جسے اسلام سے ضد اور چڑ ہو اور جو مستقل طور پر دینِ حق کے خلاف جد و جہد کرے۔ وہ اس طبقے کی برسہا برس تک تربیت کرتا رہا اور اسے مختلف عہدوں پر فائز کر کے اس بات کا اندازہ لگاتا رہا کہ یہ طبقہ اس کے ناپاک عزائم کی کس طرح تکمیل کر سکتا ہے۔ اسے جب اس بات کا پختہ یقین ہو گیا کہ اگر وہ اب اپنا براہِ راست تسلط ختم بھی کر دے تو اس کا یہ تربیت یافتہ گروہ دینِ حق کے راستے میں پوری طرح مزاحم ہو گا، تو وہ یہاں سے رختِ سفر باندھتے وقت ملک کی پوری قوت اس محدود طبقے کے ہاتھ میں دے کر رخصت ہوا اور پھر اپنے ملک میں جانے کے بعد اس بات کا التزام کیا کہ جہاں تک بھی ممکن ہو سکے پوری مغربی دنیا کو اس طبقے کی تائید بہم پہنچائی جائے۔

اس طبقے نے اس ملک کو تباہ کرنے کے لیے تین دائروں میں کام کیا۔ پہلے دائرے میں تو اس نے

اس امر کی پوری کوشش کی کہ ملک میں جمہوری نظریات و اقدار ترقی نہ کرنے پائیں، کیونکہ ان کے ترقی پانے سے اقلیت اکثریت پر اس کی مرضی کے علی الرغم مسلط نہیں رہ سکتی۔ یہاں تخلیقی اقلیت CREATIVE MINORITY کا فلسفہ گھڑا گیا اور لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بٹھائی جانے لگی کہ اس ملک کے عوام میں ابھی اس قدر سیاسی شعور موجود نہیں ہے کہ وہ اپنے لیے اپنے حکمران منتخب کر سکیں، اس لیے "عوام کالانعام" کو ترقی کے راستے پر گامزن رکھنے کے لیے صحیح صورت یہی ہے کہ ایک مختصر سی اقلیت کے ہاتھ میں ان کی نکیل تھما دی جائے اور اسے یہ آزادی دی جائے کہ وہ انہیں جس طرف چاہے لے جائے۔ اس فلسفے کی تکمیل کے لیے ملک کی قوت عوامی نمائندوں کے ہاتھ میں منتقل ہونے کے بجائے انتظامیہ کے ہاتھ میں منتقل ہو کر رہ گئی۔ پہلے تو ملک کی انتظامیہ عوامی نمائندوں میں سے اپنے ڈھب کے آدمی چن کر انہیں تختِ اقتدار پر بٹھاتی رہی، مگر آہستہ آہستہ جب اُسے اپنی قوت کا پوری طرح احساس ہو گیا، بلکہ اسے اس بات کا پختہ یقین ہو گیا کہ امورِ مملکت میں وہ ایک فیصلہ کن حیثیت کی حامل ہے تو اس نے آمرانہ ہتھکنڈوں اور سازشوں کے ذریعہ ملک پر براہ راست تسلط قائم کر لیا۔

عوامی تائید سے محروم اقلیت کو تختِ اقتدار پر متمکن رہنے کے لیے دو چیزوں کی اشد ضرورت تھی۔ ایک یہ کہ ملک کا اجتماعی ضمیر کسی طرح بیدار نہ ہونے پائے۔ عوام کے دل کی پکار کسی طرح کسی تحریک کی صورت اختیار نہ کر سکے۔ چنانچہ جو نظریہ عوام کے اجتماعی ضمیر میں موجود تھا اور اجتماعی زندگی کی تشکیل و تعمیر میں لازمی طور پر بنیاد بننے والا تھا اس کے بارے میں مختلف قسم کے شکوک و شبہات پیدا کیے جانے لگے اور اس کے عملی نفاذ کی راہ میں لاتعداد رکاوٹیں پیدا کرنے کی کوششیں شروع ہو گئیں۔ اس مقصد کے لیے کرائے کے لکھنے والے فراہم کیے گئے، متعدد ادارے قائم کر دیئے گئے، ہر گمراہ کن تحریک کی ہمت افزائی کی گئی، اور رفتہ رفتہ نشر و اشاعت کے ذرائع پر ایک ایسے گروہ کو قابض کر دیا گیا جس نے اسلام اور دین پسند تحریکات کے خلاف پوری طرح زہر اُگلا اور ہر اس فرد یا گروہ پر بڑے ناپاک حملے کر کے اُسے ذلیل و خوار کرنے کی کوشش کی جس کے متعلق اس بات کا گمان ہو سکتا تھا کہ وہ اسلامی محاذ پر کسی طرح بھی

قوت بن کر کھڑا ہو سکتا ہے۔

دوسرے، اس ملک میں شخصیت پرستی کے مسلک (PERSONALITY CULT) کا باقاعدہ پرچار شروع کیا گیا اور اس غرض کے لیے ایسی شخصیتیں اُبھاری جانے لگیں جو فی الحقیقت کبھی اپنے علمی مرتبے، یا کسی بلند اخلاقی معیار، یا قوم اور ملک کی سچی خیر خواہی، یا دین کے ساتھ گہری وابستگی اور اس کی مخلصانہ خدمت کی وجہ سے عوام کے دلوں میں عزت و احترام کی نگاہ سے نہیں دیکھی گئیں، بلکہ جو تختِ اقتدار پر کسی نہ کسی طرح سے براجمان ہوگئیں۔ ان "تخت نشینوں" کی شان میں عجیب و غریب قسم کے قصیدے پڑھے جانے لگے اور ان کی شخصیت کو اس طرح اُچھالا گیا کہ لوگوں کے دل و دماغ میں یہ تاثر قائم ہو جائے کہ ان کے ملک میں اگر ذہین، ملک کی حقیقی خیر خواہ، ایثار کی پیکر اور اعلیٰ انسانی صفات کی مظہر کوئی ذات ہے تو وہ صرف وہ ہے جو تختِ شاہی پر جلوہ افروز ہے، اور اگر ان صفات کے ہلکے عکس کہیں اور نظر آتے ہیں تو بس ان حضرات میں آتے ہیں جو اس ذات کے سایۂ عاطفت میں پل رہے ہیں۔ باقی رہے وہ لوگ جو اس ذات والا صفات سے ذرا مختلف انداز میں سوچتے ہیں تو وہ سب ملک و قوم کے بدخواہ ہیں۔

اقلیت کی حکومت اور اس کے سربراہ کے بارے میں اس قسم کے غلط اور مبالغہ آمیز تاثرات کی فضا میں کوئی ایسا نظریہ یا نظامِ حیات پنپ نہیں سکتا جو معقولیت پر مبنی ہو اور عوام میں مقبول بنانے کے لیے تبلیغ و تلقین اور دلائل کا سہارا لیتا ہو۔ سیاسی گھٹن کے اس ماحول میں وہی نظریات پروان چڑھتے ہیں جنہیں سازشوں کی مدد سے عوام پر جبر کے ساتھ مسلط کیا جا سکے۔ اس کا آسان راستہ ایک ہی ہے کہ لوگوں کا منہ بند کر کے اور برسرِ اقتدار طبقے کی مدح و توصیف میں یک طرفہ پروپیگنڈا کر کے عوام کو اصل حالات سے غافل رکھا جائے اور ان کے دل و دماغ میں ملک کے حقیقی خیر خواہوں کے بارے میں شدید غلط فہمیاں پیدا کی جائیں تاکہ وہ انہیں ہمیشہ اپنا دشمن ہی سمجھتے رہیں اور عداوت اور ذہنی کشمکش کی اس فضا میں اپنے باطل نظریات کے لیے راہ ہموار کی جائے۔ دنیا کے تمام وہ افکار اور نظامہائے حیات جو معقولیت سے عاری ہیں، وہ سب اسی نوعیت کی فضا میں لوگوں پر مسلط کیے گئے ہیں۔

مثال کے طور پر اشتراکیت کو ہی لیجیے۔ دنیا کا کوئی ایک خطہ بھی ایسا نہیں ہے جہاں اس نے دلائل کی قوت سے پہلے عوام کے دل و دماغ کو مسخر کرلیا ہو۔ اور پھر انہوں نے خوشدلی کے ساتھ اس نظام کو اپنے ہاں رواج دینے کی جدوجہد کی ہو۔ مارکس کی تعلیمات کے مطابق اشتراکی انقلاب کے لیے سب سے زیادہ انگلستان۔ جرمنی اور فرانس کی زمین ہموار تھی۔ چونکہ یہ سارے ممالک صنعتی میدان میں دنیا کے سربراہ تھے اس لیے انہی میں دولت کا ارتکاز بھی سب سے زیادہ تھا۔ پھر یہاں طبقاتی کشمکش بھی دوسرے ممالک کی بہ نسبت شدید تر تھی۔ مگر ان ممالک میں سے کسی ایک کے اندر بھی اشتراکی انقلاب برپا نہ ہو سکا، بلکہ روس جیسے زرعی اور غیر صنعتی ملک میں برپا ہوا جہاں زار کی حکومت پہلے ہی رائے عام کو مفلوج کر چکی تھی۔ اشتراکی رہنما اسے لینن کی بیدار مغزی یا بعض دوسرے اتفاقی حوادث پر محمول کرتے ہیں جو بالکل غلط ہے۔ اشتراکیت کے مطابق تو کسی ایک شخص کی قوتِ فکر و عمل حالات کے دھارے کو کبھی نہیں بدل سکتی۔ دوسرے اتفاقات اور حوادث تو اشتراکیت کی لغت میں محض افسانے ہیں۔ معاشی قوتوں کے سامنے ان کی قطعاً کوئی حیثیت نہیں۔ یہ انقلاب انگلستان، جرمنی، اور فرانس کے بجائے روس میں محض اس لیے آیا کہ زارشاہی کی بدولت ملک کے سیاسی حالات سازشوں کے لیے بڑے سازگار تھے۔ چنانچہ ایک شرمناک سازش کے ذریعے ہی یہ انقلاب روس جیسے پس ماندہ اور زرعی ملک میں برپا کر دیا گیا۔

اس نظام میں سازش کو کس قدر عمل دخل ہے۔ اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس میں خود اُن لوگوں کی جانیں بھی محفوظ نہیں ہوتیں جن کے ہاتھوں یہ نظام پروان چڑھتا ہے اور جن کے ایثار سے یہ قوت فراہم کرتا ہے۔ اگر اس نظام کے ارتقاء کا مطالعہ کیا جائے تو یُوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ نظام اپنے علمبرداروں میں اُن خود غرض اور بے ضمیر ڈاکوؤں کی سی ذہنیت پیدا کرتا ہے جو پہلے ایک ناپاک مقصد کی خاطر جتھہ بندی کرتے ہیں اور پھر "تطہیر" کے نام پر اپنے ہی ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اُتارنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ انسانیت سوز طرزِ عمل اس کے مزاج میں داخل ہے۔ دنیا کا جو نظام بھی سازش کے ذریعہ مسلط کیا جاتا ہے اس کے علمبردار اس نوعیت کا ظالمانہ طرزِ عمل اختیار کرنے پر

لازماً مجبور رہو نگے۔ ہم یہاں صرف اس کے چند واقعات نقل کرتے ہیں جن سے اس نظام کے مزاج کا صحیح اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ بورژواؤں اور سرمایہ داروں اور سامراجیوں کا تو اس نظام میں جو حشر بھی ہو وہ توعین توقع کے مطابق ہے۔ مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ اس میں ان پرولتاریوں اور اشتراکیت کے صفِ اوّل کے رہنماؤں کی جانیں بھی محفوظ نہیں رہ سکتیں جن کا شمار اس انقلاب کے علمبرداروں میں ہوتا ہے۔

مشرقی یورپ یعنی البانیہ، بلغاریہ، چیکوسلواکیہ، ہنگری، پولینڈ اور رومانیہ میں وزرائے اعظم کے بیس نائبین، کابینہ کے پچاس ارکان، قریب قریب تمام وزرائے خارجہ، ایک سو جرنیل اور ایک ہزار اونچے سرکاری افسر اس تطہیر کا نشانہ بنے۔ صرف بلغاریہ میں تطہیر کے نام پر جو اشتراکی خود اشتراکیت کے ہاتھوں ظلم و ستم کا شکار ہوتے ان میں نائب وزیر اعظم، وزیر خزانہ، وزیر صنعت، وزیر تعمیرات، وزیر مواصلات و تجارت، وزیر خارجہ، نیشنل بنک کا گورنر اور اس کے نائبین، خفیہ پولیس کا افسرِ اعلیٰ اور اس کے نائبین، فوجی اور سیاسی شعبے کے حاکمِ اعلیٰ، معاشی منصوبہ بندی کے ناظم، اور تین نائب وزرائے خارجہ شامل ہیں۔

چیکوسلواکیہ میں مئی ۱۹۴۹ء میں حکومت کی زمام کار سات افراد کے سپرد کی گئی جن میں سے ۱۹۵۳ء تک صرف ایک آدمی زندہ بچا اور باقی سب کا خون بہایا گیا۔ یہ خوش نصیب شخص جس کا نام گوٹ والٹ (GOTTWALD) تھا۔ وہ بھی بڑے مشکوک حالات میں موت کی نیند سلا دیا گیا۔

روس میں تطہیر کے اس عمل سے اشتراکیت کے عظیم رہنما بھی محفوظ نہ رہ سکے اور ان پر غداری کے الزامات لگا کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء تک دس سال کی مدت کے اندر گیارہ میں سے ۹ وزراء کا خاتمہ ہوا۔ اشتراکی پارٹی کی مرکزی تنظیم کے ۵۳ ارکان میں سے ۴۳ ارکان گولی کا نشانہ بنائے گئے۔ ۲۷ میں سے ۱۵ وہ معروف اشتراکی جنہوں نے سوویت روس کے دستور کا مسودہ تیار کیا تھا۔ روس کی

جنگی کونسل کے اسّی میں سے ستّر ارکان، روسی فوج کے ۵ میں سے تین مارشل، ساٹھ فیصد جرنیل اور تیس ہزار افسر فنا کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ اشتراکیت انسانوں کے مابین جس نوعیت کی بد اعتمادی اور جس قسم کا سازشی ذہن پیدا کرتی ہے، اس کی اس سے بڑی المناک مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد لینن نے جو انتہائی ذمہ دار افراد پر مشتمل کابینہ تشکیل دی تھی اس میں اسٹالن کے سوا اور کوئی نہ بچا۔ مارچ ۱۹۵۳ء میں سٹالن کی موت کے بعد ملک کی زمامِ کار مالنکوف، بیریا اور مولوٹوف کے ہاتھ میں آئی اور چار ماہ بعد بیریا[1] پر غداری کا الزام لگا کر اُسے ٹھکانے لگا دیا گیا۔

اشتراکیت کے بارے میں جب تلخ حقائق سامنے آتے ہیں تو اشتراکی کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ یہ سامراجیوں کی من گھڑت باتیں ہیں۔ مندرجہ بالا واقعات ہم نے "اشتراکیوں کے ساتھ کیا بیتتی ہے؟" "WHAT HAPPENS TO COMMUNISTS" سے لیے ہیں۔ اس کتابچے کا مصنف MICHAEL PADVE ہے اور یہ ۱۹۵۳ء میں لندن سے شائع ہوا ہے۔ اس کے تتمے میں مصنف نے ان معروف اشتراکی شخصیتوں کا تعارف مع ان کی مظلومیت کی نوعیت کے درج کیا ہے جنہیں تطہیر کی بھٹی میں سے گزارا گیا۔ اتنے واضح ثبوت کے بعد آخر حقائق کو کس طرح جھٹلایا جا سکتا ہے؟ اشتراکیوں کی جسارت کا تو یہ عالم ہے کہ یہ ان واقعات کو جھٹلانے میں قطعاً متأمل نہیں ہوتے جو خود ان کی اپنی تصنیف کردہ کتب میں درج ہیں۔ مثلاً یہاں ہم نے تطہیر کی جس المناک داستان کو بیان کیا ہے، اس کی تائید خود ماسکو کی چھپی ہوئی سرکاری کتاب یو۔ ایس۔ ایس۔ آر کی مختصر تاریخ A SHORT HISTORY OF THE U.S.S.R سے ہوتی ہے۔ اس کتاب کے مرتب نے اس امر کا واضح اعتراف کیا ہے کہ سوویٹ یونین میں ایک سازش کے تحت عوام کو شخصیت پرستی کا مسلک اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا اور خاص طور پر سٹالن کے

---

[1] یہ بیریا کون تھا؟ اس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں۔ دوسری جنگ عظیم کی جنگی کونسل کے پانچ ارکان میں سے ایک اہم رکن، سٹالن کا ۲۰ سال کا نہایت قابل اعتماد رفیق کار، روس کے داخلی تحفظ کا ۱۹۳۸ء سے لے کر ۱۹۵۳ء تک ناظم اعلیٰ۔

بارے میں ان کے دلوں پر یہ نقش بٹھانے کی کوشش کی گئی کہ وہ ہر عیب سے پاک اور ہر خطا سے مامون ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اجتماعی قیادت کے تصور کو نقصان پہنچا اور سٹالن نے اپنی پوزیشن سے ناجائز فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔ اس کے علاوہ اس کے مزاج میں خشونت اور درشتگی پیدا ہو گئی تھی، پارٹی کے معزز ارکان سے بے وفائی کرنے میں اسے قطعاً کوئی تامل نہ تھا، اور وہ کوئی معمولی تنقید بھی برداشت کرنے پر آمادہ نہ ہوتا تھا۔ مشترکہ مرکزی انضباطی کمیشن، جس نے ایک ہاتھ میں اتنے وسیع اختیارات مرتکز کرنے کی مخالفت کی تھی اسے توڑ دیا گیا۔ یکم دسمبر ۱۹۳۴ء کو سرجی کیروف (SERGEI KIROV) جو لینن گراڈ کی علاقائی کمیٹی کا سیکرٹری اور پولیٹکل بیورو کا رکن تھا، لینن گراڈ میں قتل کر دیا گیا۔ اس قتل کے بارے میں آج تک جتنے واقعات سامنے آئے ہیں ان سے یہی پتہ چلتا ہے کہ یہ عوام کو ہراساں کرنے، مخالف ارکان اور ان دیانتدار افراد کو دبانے کا بہانہ تھا جو اگرچہ پارٹی کے ساتھ تو بڑے مخلص تھے مگر سٹالن کی نظر میں ناپسندیدہ تھے۔ سٹالن نے ملک کے داخلی انتظام کی کمیٹی پر سے پارٹی کا انضباط ختم کر کے اسے براہِ راست اپنی تحویل میں لے لیا اور اپنے منشا کے مطابق اثیر یوف کو کمیٹی کا ناظم مقرر کیا۔ اس شخص نے اشتراکی پارٹی کے بہت سے جاں نثاروں کو تباہ و برباد کیا۔ اس کے بعد یہ عہدہ بیریا کے سپرد کیا گیا جس نے پارٹی کے ارکان پر نہایت بھیانک مظالم ڈھائے۔ بہت سے ایسے افراد جنہوں نے سٹالن کی من مانی کارروائیوں پر احتجاج کیا یا تو جیلوں میں ٹھونس دیئے گئے یا موت کی آغوش میں سُلا دیئے گئے۔ بعض نے مایوسی کے عالم میں خودکشی کر کے اس عذاب سے نجات پائی۔ شخصیت پرستی کے اس مسلک نے ملک کے اندر عدم اعتماد اور شکوک و شبہات کی عام فضا پیدا کر دی"۔ (ص ۱۸۳ - ص ۱۸۱)

یہ وہ اعتراف ہے جو خود اشتراکی حکومت نے اشتراکیت کے مزاج حکمرانی کے بارے میں کیا ہے اور یہ اُس سٹالن کا کارنامہ ہے جسے سالہا سال تک اشتراکی "عظیم باپ" کہہ کر اپنا ہیرو بنائے رہے۔ اِسے پڑھنے کے بعد یہ بات بڑی آسانی سے سمجھی جا سکتی ہے کہ دنیائے اشتراکیت میں سازشوں کا کیوں اس قدر عمل دخل ہے اور یہاں انسانی خون کیوں اس قدر ارزاں ہے۔

جو ممالک روس کے زیرِ اثر ہیں وہ بھی بڑے وسیع پیمانے پر تطہیر کا عمل کرنے پر مجبور ہیں اور ماسکو سے اس سلسلے میں بروقت ہدایات جاری ہوتی رہتی ہیں۔ فروری ۱۹۵۲ء میں چیکوسلوواکیہ کی اشتراکی حکومت نے اشتراکی لیڈر روس کے ایک بہت بڑے گروہ کو گرفتار کر کے اس پر مقدمہ چلایا۔ ان میں کمیونسٹ پارٹی کا سکرٹری جنرل بھی شامل تھا۔ نومبر میں مقدمہ کی کارروائی شروع ہوئی اور ۳ دسمبر کو ان ناموراشتراکیوں کو پھانسی پر لٹکادیا گیا۔ جن بدنصیبوں کو قید و بند میں ڈالا جاتا ہے یا موت کے گھاٹ اتارا جاتا ہے ان کے خلاف الزام کی نوعیت عام طور پر یہی ہوتی ہے کہ وہ سویٹ یونین کے بارے میں غیر ہمدردانہ جذبات رکھتے ہیں یا سویٹ کے تجربے کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب جو ملک بھی اشتراکیت کا دعویدار ہو یا اس نظام کو اپنانے کی کوشش کرے اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنا قبلہ ماسکو کو ٹھہرائے اور زندگی کے ہر معاملے میں وہیں سے رہنمائی حاصل کرے۔ اس سلسلے کی ایک نہایت ہی عبرتناک مثال حکومت بلغاریہ کا سٹالن کے نام ایک تار ہے۔ دسمبر ۱۹۴۹ء کو بلغاریہ کی اشتراکی پارٹی کے سکرٹری جنرل اور نائب وزیراعظم کو اشتراکیت سے بے وفائی کا الزام لگا کر گرفتار کیا گیا اور اسے موت کی سزا دی گئی۔ حکومت بلغاریہ نے یہ ظالمانہ کارروائی کرنے کے بعد سٹالن کی خدمت میں یہ تار ارسال کیا۔

"بے حد قابلِ تعظیم کامریڈ سٹالن! آپ کی بروقت اور دانشمندانہ ہدایات کا بے حد شکریہ جن کی وجہ سے ہم اپنی جمہوریہ کے چھپے ہوئے مگر بزدل دشمن کو بے نقاب کرنے میں کامیاب ہوئے۔ صرف آپ ہی کی دُوررس نگاہیں کاسٹوف کے جاسوسی گروہ کی مجرمانہ کارروائیوں کو بھانپ سکتی تھیں۔"

ان اشتراکی ممالک میں جن "باغیوں" کو سزا دی جاتی ہے۔ اوّل تو ان پر مقدمہ ہی نہیں چلایا جاتا خفیہ کارروائی ہی سے انہیں اس طرح ٹھکانے لگادیا جاتا ہے کہ مظلوموں کی لاشوں تک کا پتہ نہیں چلتا۔ ان میں اگر ایک ہزار آدمی کے خونِ ناحق سے اشتراکی سرزمین لالہ زار بنتی ہے تو بمشکل دس افراد کے لیے عدالت کا ڈراما کھیلا جاتا ہے۔ صرف روس میں بلامبالغہ لاکھوں افراد کو لقمۂ اجل بنایا گیا۔ مثلاً ۱۹۳۰ء کی تطہیر میں لاتعداد

افراد کے خلاف نہایت سنگین قسم کی کارروائیاں کی گئیں، ممبران میں سے صرف ۴۲ کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ یہی صورت حال روس کے حاشیہ بردار ممالک میں ہے۔

پھر اس عدالتی ڈرامے کا بھی ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ جن مجرمین کو یہاں پیش کیا جاتا ہے ان کی عظیم اکثریت اپنے جرائم کی رُوداد فرفر سناتی چلی جاتی ہے اور خود عدالت سے استدعا کرتی ہے کہ اسے پھانسی کی سزا دی جائے۔ مثلاً مارچ ۱۹۳۸ء میں NIKOLAY KRESTINSKY روس کے سابق نائب وزیر خارجہ پر جب مقدمہ چلایا گیا تو اس نے پہلے روز عدالت میں یہ کہا کہ وہ بالکل بے گناہ ہے۔ مگر دوسرے روز ہی اس کا ذہن تبدیل ہو گیا اور اس نے عدالت سے درخواست کی کہ وہ اپنے جرم کا اعتراف کرتا ہے، لہٰذا اسے قبول کر کے اسے سزا دی جائے۔

پھر ان باغیوں کی پریس میں اس انداز سے تحقیر و تذلیل کی جاتی ہے کہ اس کے تصوّر سے انسانی روح کانپ اٹھتی ہے۔ کسی انسان کے لیے اس سے زیادہ اذیت اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ بالکل بے گناہ ہو اور محض معمولی سے اختلاف کی پاداش میں اس کے خلاف جھوٹا مقدمہ کھڑا کیا جائے، پھر پولیس اور فوج کے سربراہ اسے ناقابل بیان اذیتیں پہنچا کر اس سے ناکردہ گناہ کا اعتراف کروائیں، اس کے بعد اس کی لاش کی بے حرمتی کی جائے اور پریس اور نشر و اشاعت کے دوسرے ذریعوں سے اسے رسوا اور ذلیل کیا جائے اور اس رسوائی کرنے والوں میں خود اس کی اپنی اولاد کو شامل کیا جائے۔ ۱۹۵۲ء میں LUDWIG FREJKA چیکوسلوواکیہ کے صدر کے معاشی مشیر اعلیٰ پر مقدمہ چلایا گیا تو اس کے بیٹے کی طرف سے مندرجہ ذیل خط ریڈیو پر نشر کیا گیا۔

"میں اپنے باپ کے لیے سنگین سزا یعنی موت کی سزا کا طالب ہوں۔ اب مجھے اس امر کا احساس ہو رہا ہے کہ یہ مخلوق انسان کہلانے کی بھی مستحق نہ تھی۔ میرا باپ میرا سب سے بڑا اور سب سے سخت دشمن ہے۔ ایک مخلص اشتراکی ہونے کی وجہ سے مجھے اس بات کا احساس ہے

کہ (اشتراکیت) کے دشمنوں کے خلاف میری نفرت خصوصاً باپ کے خلاف نفرت مجھے مستقبل میں اشتراکیت کی جدوجہد میں قوت بہم پہنچائے گی۔[1]

اشتراکیت کے ان عدالتی ڈراموں کا مقصد خود ایک بہت بڑے روسی قانون دان نے یہ بیان کیا ہے:

"اشتراکی عدالت کے قیام کا مقصد رحم کے سارے احساسات سے عاری ہو کر علم دشمن عناصر کا قلع قمع کرنا ہے، خواہ وہ اشتراکیت کے خلاف اپنی مجرمانہ سرگرمیوں کا کسی صورت میں اظہار کریں۔ یہ ساری عدالتیں درحقیقت جماعتی پالیسی کا آلہ کار ہیں۔ اشتراکی انصاف مزدور طبقوں کے ہاتھ میں ظلم کا ہتھیار ہے۔ اشتراکی جج کو اس بنا پر صرف قانونی منطق کو پیش نظر نہ رکھنا چاہیئے بلکہ یہ بات ہمیشہ اس کے ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ قانون فی الحقیقت پارٹی کے مسلک کا اظہار ہے۔ جب پارٹی کی پالیسی قانون سے متصادم ہوتی نظر آئے تو ایسے قانون کو بلا تامل رد کر دینا چاہیئے تاکہ وہ پارٹی کی دی ہوئی ہدایات کی غیر مشروط طور پر اطاعت کر سکے کیونکہ یہی اس کی نظر میں سب سے بالا قانون ہونا چاہیئے۔[2]

جب کسی ملک کے نظامِ عدل کا یہ مقصد ہو تو حق و انصاف کا جو حشر ہو گا اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔ چنانچہ اشتراکی ممالک کی عدالتوں میں باغیوں کا اعترافِ جرم زندگی کا بالکل معمول بن گیا ہے۔ ایک آسٹروی اشتراکی نے اپنی کتاب CONSPIRACY OF SILENCE میں اس اعترافِ جرم کے نہایت ہی عبرتناک واقعات درج کیے ہیں۔ وہ بتاتا ہے کہ بہت سے ایسے حکام جو اسے جیل میں اعترافِ جرم کرانے پر مامور ہوئے تھے۔ خود ان پر غداری کا الزام لگا کر انہیں اس کے ساتھ ہی جیل میں بند کر دیا گیا۔ وہ خود تو ایک عرصہ تک اس اعتراف کے اذیت ناک چکر میں سے گذرتا رہا، مگر جو اس سے یہ اعتراف اگلوانے پر مامور تھے انہوں

---

[1] WHAT HAPPENS TO COMMUNISTS P.21

[2] THE LAW OF THE SOVIET STATE.

نے خود باغی اور غدار ہونے کا اعتراف کر لیا اور اس کی سزا پائی۔

دوسرا واقعہ اس سے بھی زیادہ دردناک ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر نازیوں کے جنگی قیدیوں پر مقدمہ چلایا گیا۔ اس مقدمے کے سلسلے میں سٹالن کے بعض قریبی ساتھیوں پر یہ الزام لگایا گیا کہ انہوں نے نازیوں سے مل کر اپنے رہنما کو قتل کرنے اور یورپی روس کا قریب قریب نصف حصہ جرمنوں کے حوالے کرنے کا منصوبہ تیار کیا ہے۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ روسیوں کو تو ان اعترافات کے تحت سنگین سزائیں دی گئیں مگر سرکاری وکیل نے نازی قیدیوں کے بارے میں اس الزام کا کہیں اشارہ نہیں کیا۔ جرمن کی شکست کے بعد اس ملک کی تمام خفیہ دستاویزات برطانیہ، امریکہ اور روس کے قبضے میں آگئی ہیں اور ان میں سے اکثر شائع بھی ہو چکی ہیں مگر ان میں سے کہیں بھی "تطہیر شدہ" روسی رہنماؤں اور نازیوں کے مابین اس سازش کا ذکر نہیں ملتا۔

آمریت اور جبر و تشدد اشتراکیت کے مزاج میں داخل ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اشتراکیت کا خمیر ہی سازش، آمریت، استبداد اور دہشت گردی سے اٹھایا گیا ہے، تو یہ زیادہ صحیح ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔ جو نظام فطرت انسانی سے جسقدر دور ہوگا اسی نسبت سے اُسے عوام پر اپنے آپ کو مسلط کرنے کے لیے اندھی بہری قوت کا بے محابا استعمال کرنا پڑے گا۔ چنانچہ اشتراکیت کی پوری تاریخ میں مندرجہ ذیل واضح رجحانات ملتے ہیں:

- ملک کی اجتماعی قوت کا ایک مرکزی طاقت کے ہاتھ میں ارتکاز تاکہ وہ بلا روک عوام کو جس طرف چاہیے لے جائے۔
- سازش کی مدد سے عوام کی گردنوں پر تسلط اور پھر سازش کے ذریعے ہی اس تسلط کو تادیر قائم رکھنے کا ناپاک جذبہ۔
- اشتراکیت کو معقولیت اور دلیل کی مدد سے مقبول بنانے کے بجائے جبر و تشدد کے ذریعے نافذ کرنے کا داعیہ۔
- معمولی معمولی اختلاف پر غیر معمولی برہمی کا اظہار اور اختلاف کرنے والوں یا جن پر اختلاف کا شبہ

بھی ہو انہیں ختم کرنے کے لیے ہر قسم کے ناجائز ہتھکنڈوں کا استعمال۔

- دہشت پھیلا کر عوام کو خاموش کرنے کا حربہ۔
- اختلاف کرنے والوں پر چند معروف اور گھڑی گھڑائی گالیوں کی بوچھاڑ۔

روس میں اشتراکی انقلاب کے سب سے بڑے علمبردار لینن جس کی قیادت میں عملاً اشتراکی نظام قائم ہوا، اس نے خود ان غیر اخلاقی حربوں کا پرچار کیا ہے اور اِس بات کو پورے زور سے بیان کیا ہے کہ تشدد اس انقلاب کا ضروری جزو ہے اور اس کے بغیر اس نظام کو نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اپنے ایک خطاب میں اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کہتا ہے:

"اشتراکی آمریت غیر محدود قوت ہے جس پر قوانین کوئی پابندی نہیں لگا سکتے۔ اس کا سارا دارو مدار تشدد پر ہے۔"[۱]

ایک دوسرے مقام پر وہ اشتراکی ریاست کی غایت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"ریاست تو ایک ایسا ادارہ ہے جو ظلم و تشدد کے لیے معرض وجود میں آتا ہے انقلاب سے پہلے روپے پیسے کی چند بوریاں عوام پر ظلم کرتی تھیں، مگر اب ہم عوام کے مفاد کے لیے اس استبداد کو منظم کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔"[۲]

روس میں جب یہ اشتراکی انقلاب آیا تو نہ صرف باغیوں کی زندگیوں کا خاتمہ کیا گیا بلکہ معمولی معمولی باتوں پر لوگوں کو گولی ماردی گئی۔ رائی بنسک RYBINSK کے علاقے میں جو لوگ بھی گلی کوچوں میں جمع ہونے کی جسارت کرتے تھے، انہیں بغیر انتباہ کے گولی کا نشانہ بنا دیا جاتا تھا۔ کالوگا کے صوبے میں جو لوگ فوجی ٹیکس ادا نہ کر سکے وہ موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے اور ایک دوسرے صوبے ژمبرف میں جن لوگوں سے اس معاملے میں کوتاہی ہوئی ان کی گردنوں کے ساتھ پتھر باندھ کر انہیں دریا میں ڈبو دیا گیا۔[۲]

۱؎ LENIN, BY DAVID SHUB, P.312

۲؎ " P 348

روس اور بعض دوسرے اشتراکی ممالک کے بارے میں یہ حقائق کوئی ایسے نہیں جنہیں بڑی چھان بین کے بعد جمع کیا گیا ہو۔ اس نوعیت کے ہزاروں نہیں لاکھوں واقعات مختلف کتابوں میں بکھرے پڑے ہیں، جنہیں ہر شخص خود پڑھ کر اس نظام کی قہرمانیوں کا بخوبی اندازہ کر سکتا ہے۔ اہل پاکستان اس وقت بڑے فیصلہ کن مرحلے میں سے گزر رہے ہیں۔ ایک طرف حال یہ ہے کہ سرمایہ داری کا دیو استبداد عوام کا لہو چاٹ رہا ہے اور گذشتہ بائیس سالوں میں اس دیو نے غریب عوام کے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا ہے۔ اسی لیے اُن کے دل میں اس نظام کے خلاف فطری طور پر شدید نفرت ہے۔ اس جذبے میں کوئی چیز بھی خلاف توقع نہیں۔ ظلم و استبداد اور جور و جفا کو آخر کون سراپا رحمت اور انصاف سمجھ سکتا ہے۔ اس ملک کے باشندوں کا اس عذاب سے نجات حاصل کرنے کی خواہش کرنا قانونِ فطرت کے عین مطابق ہے۔ ہم خود سرمایہ داری کو انسانیت کے لیے ایک زبردست لعنت سمجھتے ہیں اور اسے ختم کرنے کے دل و جان سے اتنے ہی آرزومند ہیں جتنا کہ انسانیت کا کوئی بھی خواہ ہو سکتا ہے۔ پھر ہمیں اس امر کا بھی شدید احساس ہے کہ اس سرمایہ داری نے ہی سفید سامراج کو جنم دیا ہے جس کے ہاتھوں اُمتِ مسلمہ کو گذشتہ دو سو سال میں شدید نقصان پہنچا ہے اور آج بھی مسلم قوم کے خلاف جو شرمناک سازشیں دنیا میں ہو رہی ہیں ان میں سفید سامراج کا بڑا ہاتھ ہے۔ مگر دوسری طرف ہم پوری دردمندی اور دل سوزی کے ساتھ اُمت مسلمہ کو اس خطرے سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں جو سُرخ سامراج کے اندر چھپا ہوا ہے۔ اس سامراج کے ہاتھوں بھی اسلام اور مسلم ممالک کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔ آج تاشقند، بخارا، سمرقند اور کاشغر اس کی ستمرانیوں پر نوحہ خواں ہیں۔ ان دونوں سامراجوں کے مزاج میں قطعاً کوئی فرق نہیں۔ دونوں مادیت پرستی کے علمبردار ہونے کی بنا پر انسانیت کے لیے دردناک عذاب ہیں۔ اشتراکیت سرمایہ داری کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے۔ سرمایہ داری میں دولت اور قوت چند طبقوں میں سمٹ آتی ہے اور اشتراکیت میں یہ دولت اور قوت ایک ہاتھ میں منتقل ہو جاتی ہے۔ سرمایہ داری میں انسان کی بہ نسبت بے جان سکوں کی قدر و قیمت زیادہ ہوتی ہے۔ اشتراکیت میں انسان معاشی مشین کا محض ایک پرزہ بنا دیا جاتا ہے اور اسے معاشی و سیاسی مفاد کی قربان گاہ پر بے دریغ بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام بھی انتظامیہ کی مدد سے چلتا ہے اور اشتراکی نظام بھی فوج اور پولیس کی حفاظت میں زبردستی عوام پر مسلط کیا جاتا ہے۔ سرمایہ داری سے رستے ہوئے لوگوں کو بلاشبہ اس بات کا پورا حق حاصل ہے کہ وہ اس سے نجات پانے کے لیے جدوجہد کریں، مگر انہیں اس جدوجہد

کا آغاز کرنے سے پہلے اس بات پر پوری طرح غور کر لینا چاہیئے کہ کہیں وہ ایک عذاب سے نکل کر کسی دوسرے عذاب میں تو مبتلا نہیں ہو رہے۔ پھر ان لوگوں کو اس بات پر بھی سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے کہ جو نظام سازشوں کے بل بوتوں پر قائم کیا جائے اور جس میں رائے کے معمولی اختلاف کو بھی برداشت نہ کیا جا سکتا ہو، کیا اس نظام میں اس امر کی توقع ہو سکتی ہے کہ سرمایہ داری سے نجات کے بعد اُسے مسلم قوم اپنے دینی تقاضوں کے مطابق ڈھالنے میں کامیاب ہو جائے گی؟ جو لوگ اشتراکیت کے صفِ اوّل کے رہنماؤں میں شمار ہوتے تھے جب وہ ان سازشوں کا شکار ہو کر لقمۂ اجل بنا دیئے گئے تو آخر ان سادہ لوح لوگوں کو کس طرح برداشت کیا جائے گا جو اس کی مادی اساس کو قبول کرنے میں ذرا متامل ہوں گے؟ ان اشتراکیوں کی وفاداری کا تو یہ عالم ہے کہ وہ بیریا، جسے ملک کا سب سے بڑا اخبار پراودا سٹالن کا شاگردِ رشید اور جاں نثار لکھا کرتا تھا، اور جسے ۱۹۵۰ء کے سوویٹ انسائیکلوپیڈیا میں سوویٹ اشتراکی پارٹی اور حکومت کا ایک نمایاں لیڈر بیان کیا گیا تھا، وہ ۱۹۵۳ء میں نہ صرف غداری کے الزام میں قتل ہوا بلکہ ماسکو ریڈیو نے اُس کے حق میں یہ فتویٰ دیا کہ وہ کمینہ مرتد، رذیل دشمن، ملعون، قابلِ نفرت غدار، شیطان، عوام دشمن، سرمایہ داروں کا ایجنٹ، باؤلا کتا، طالع آزما تھا۔ یہ اشتراکی لغت کی پوری گالیاں نہیں ہیں، صرف ان کا ایک نمونہ ہے۔

ہمیں جب اپنے خالق اور مالک نے اسلام کی صورت میں ایک متوازن نظامِ زندگی دیا ہے اور جس کے حیات آفریں ثمرات سے پوری انسانیت لذت آشنا ہو چکی ہے تو پھر ہمیں آخر کیا ضرورت ہے کہ ہم انہی دو ظالمانہ نظاموں میں سے کسی ایک کا انتخاب کر کے اس کی سربلندی کے لیے کوششیں کرتے پھریں؟ کفر کے لیے جدوجہد کرنا دنیا اور آخرت دونوں میں گھاٹے کا سودا ہے، خواہ یہ بُت پرستی کے لیے ہو یا سرمایہ داری یا اشتراکیت کے لیے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حالات کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔